ڈاکٹر برنارڈ لوئیس

عربوں کے احسانات، یورپ پر

ایک حقیقت، جس کا دشمن بھی اعتراف کرتے ہیں

پروفیسر برنارڈ لوئیس بزرگ مستشرق ہیں۔ وہ کافی عرصہ یونیورسٹی آف لندن میں "مشرقِ وسطیٰ کی تاریخ" کے استاد رہنے کے بعد ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی پرنسٹن یونیورسٹی سے منسلک رہے ہیں۔ انہوں نے اسلام اسلامی تاریخ اور اسماعیلی شیعیت کے ساتھ ترکی اور مشرقِ وسطیٰ پر متعدد کتب اور مقالات لکھے ہیں "کیمبرج ہسٹری آف اسلام" کے مرتبین میں شامل ہیں، تاہم وہ مستشرقین کے اُس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو اسلام اور مشرق کے بارے میں وسیع القلبی پیدا نہیں کر سکا۔ ۱۹۴۰ء کے لگ بھگ انہوں نے بی۔ بی۔ سی (لندن) کے عربی پروگرام میں "انگلستان اور عربی علوم و فنون" کے موضوع پر چھ تقریریں نشر کی تھیں۔ اسی زمانے میں انگریزی متن BRITISH CONTRIBUTIONS TO ARABIC STUDIES [لندن: لانگ مینز (۱۹۴۱ء)] اور عربی ترجمہ شائع ہو گیا تھا۔ شعبۂ اطلاعات حکومتِ ہند نے اردو ترجمہ جید برقی پریس (دہلی) سے شائع کیا تھا جو ایک شاذ ہی نظر آتا ہے۔ یہ کمیاب کتابچہ جہاں اس لحاظ سے اہم ہے کہ دوسری عالمی جنگ کے دوران میں برطانوی ذرائع ابلاغ اور اُن کی پالیسیوں کو سمجھنے میں اس سے مدد ملتی ہے، وہیں اِس سے مؤلف پروفیسر لوئیس کی علمی دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے۔ ۱۹۴۰ء میں انہوں نے جس موضوع پر نشری تقاریر لکھیں، وہی ۱۹۸۲ء میں زیادہ تفصیل کے ساتھ اُن کی تالیف THE MUSLIM DISCOVERY OF EUROPE [نیویارک: ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ نارٹن] میں زیرِ بحث آیا ہے۔

ڈاکٹر برناڈ لوس کے تحقیقات تعبیرات اور آراء ان کی اپنی فکری رجحان کے ترجمان ہیں مگر اس کے باوجود مضمون میں یورپ پر عربوں کے احسانات کا اعتراف ہے

ہٰذا عالم اسلام اور عیسائیت کے شکریہ کے ساتھ نذر قارئین ہے۔

قرونِ وسطیٰ

ایک مدت تک محققین کا یہ خیال رہا کہ اسلامی اور فرنگی تہذیبیں پہلے پہل ایک دوسرے سے خاص طور پر صلیبی لڑائیوں کے سلسلہ میں روشناس ہوئیں۔ یہ واقعہ ہے کہ یہی پہلا

موقع تھا جب عربی مشرق اور عیسائی مغرب میں گہرا تعلق پیدا ہوا اور یقیناً دونوں ایک دوسرے کی تہذیب سے مستفید بھی ہوئے، مگر زمانہ حال کی تاریخی تحقیقات سے یہ بات ظاہر ہوگئی ہے کہ یہ باہمی استفادہ اثر اوسعت کے لحاظ سے بہت محدود تھا جیسا کہ اس واقعہ کی نمایاں فوجی نوعیت پر نظر کرتے ہوئے اسے ہونا بھی چاہیئے تھا۔ مغرب میں عموماً اور انگلستان میں خصوصاً عربی علوم و افکار کے پہنچنے کا ایک دوسرا ہی ذریعہ تھا۔

شمالی افریقہ کو فتح کرنے کے بعد فاتح عرب نصرت و کامرانی کے پرچم اڑاتے ہوئے یورپ تک نکل آئے اور ایک عرصہ تک ان کی نوآبادیاں بحیرۂ روم کے خطے کے دو اہم علاقوں میں قائم رہیں۔ عربوں نے اسپین اور صقلیہ (سسلی) میں ایک ایسی شاندار تہذیب کی بنیاد رکھی جو اس وقت کے تمام عیسائی ممالک کی تہذیب سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھی۔ یہ تہذیب اپنی ہم عصر عیسائی تہذیبوں پر اثر انداز ہو کر رہی۔ اس وقت بھی جب کہ یہ علاقے پھر عیسائیوں کے ہاتھ آ گئے، کچھ عرصہ تک وہاں عربی علوم و فنون کا ویسا ہی چرچا رہا۔ عیسائی بادشاہ خود عربی زبان بولتے اور عرب علماء کی امداد کرتے رہتے)۔ ابتدا ہی سے عربوں کی برتر و اعلیٰ تہذیب کے اثرات فرنگی ممالک میں پہنچنے لگے۔ اسپین کے عربی بولنے والے عیسائی اس اثر کو آگے بڑھانے کا اہم ذریعہ ثابت ہوئے اور اسپین اور سسلی کے عربی بولنے والے یہودیوں نے بھی جن کی زبان ان کے ہم مذہب فرنگیوں کی طرح عبرانی تھی، مغرب میں عربی علوم و فنون کو پھیلانے میں بہت مدد دی۔ ہم اس سلسلہ میں ایک ہسپانوی یہودی فلسفی اور عالم ابراہیم بن عزرا کا خاص طور پر ذکر کریں گے۔ یہ شہر طلیطلہ کا رہنے والا تھا اس نے ۵۹-۱۱۵۸ء میں لندن کا سفر کیا اور کچھ دنوں وہاں تعلیم و تدریس کا کام بھی انجام دیا۔ اسی طرح ایک انگریز ٹامس براؤن (THOMAS BROWN) کا ذکر بھی کر سکتے ہیں جو سسلی میں قاضی تھا اور عربی دستاویزات میں اسے "قاضی بردن" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

بارہویں صدی میں شمالی ممالک خصوصاً انگلستان کے علماء طلب علم کی غرض سے اسپین کی عرب یونیورسٹیوں میں آنے لگے۔ ان علماء میں پہلا اور بزرگ ترین عالم شہر باتھ (BATH) کا رہنے والا انگریز ایڈیلارڈ (ADELARD) تھا۔ یہی شخص تھا جس نے مغرب میں عربی علوم و فنون کے پھیلانے میں پہل کی۔ بارہویں صدی کے ربع اول میں ایڈیلارڈ نے عربی زبان اور عربی علوم حاصل کرنے کی غرض سے طول طویل سفر کیے۔ اس نے اپنے ہم عصر عیسائیوں کے لیے بہت سی عربی کتابوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا اور واپسی پر انگلستان کے ہونے والے بادشاہ ہنری کے نام معنون کی۔ اس کی اہم ترین تصنیف NATURAL QUESTIONS (مسائل طبیعیہ) ایڈیلارڈ اور اس کے بھتیجے کے درمیان ایک مکالمہ کی صورت میں ہے۔ بھتیجے نے فرنگیوں کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی تھی اور ایڈیلارڈ نے عربوں کے یہاں۔ اس مکالمہ کے ذریعہ انہیں دو مختلف اصولوں اور نظریوں میں باہم

مقابلہ کیا گیا ہے۔ ایڈیلارڈ اس کتاب کے مقدمہ میں لکھتا ہے کہ "میں عربوں کے نظریہ کی حمایت کروں گا۔ خود اپنی شخصی رائے پیش نہ کروں گا۔" پھر اُس نے نہایت تفصیل کے ساتھ "عرب طریقہ" کی برتری بیان کی اور اپنے ملک کو کام میں لاکر مغرب میں اسی طریقہ کے پھیلانے میں بہت مدد دی۔ اس نے علم ہیئت اور ریاضی کی بہت سی عربی کتابوں کا ترجمہ کیا اور اس طرح یورپ میں اِن علوم کو ترقی دی۔

ایڈیلارڈ کے بعد بہت سے دوسرے انگریز علماء اسپین گئے۔ شہر چسٹر (CHESTER) کے ایک شخص رابرٹ (ROBERT) نے بھی بارہویں صدی میں علمِ ریاضی حاصل کیا اور عربی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ ڈینیل آف مورلے (DANIEL OF MORLEY) بھی اُس زمانہ کی قابلِ ذکر شخصیتوں میں سے تھا جیسا کہ وہ خود اپنے متعلق بیان کرتا ہے۔ اسے فرنگی یونیورسٹیاں پسند نہ تھی اس لیے وہ دنیا کے زیادہ بالغ نظر حکماء کی تلاش میں "اسپین گیا۔ یہاں سے وہ کتابوں کا ایک ذخیرہ ساتھ لے کر واپس آیا جسے پڑھنے والوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ تیرہویں صدی میں میکائیل اسکاٹ (MICHAEL SCOT) نے سسلی میں تعلیم پائی اور عربی اور عبرانی زبانوں میں دستگاہ حاصل کی۔ اُس نے ارسطو کی تصنیفات کا عربی سے ترجمہ کیا اور اس طرح ان میں سے بہت سی کتابوں سے مغرب پہلے پہل روشناس ہوا۔ اُس نے ارسطو کی تصنیفات کی عربی شرحوں کا بھی ترجمہ کیا اور خود علمِ ہیئت اور علمِ کیمیا پر بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔

ان علماء اور اِن کے علاوہ ان دوسرے حوصلہ مند انگریزوں کی تصنیفات کا جنہوں نے تحصیلِ علم کی خاطر مصائب برداشت کر کے عربی ممالک کا سفر اختیار کیا، تہذیب پر بہت اثر پڑا۔ یہ انہیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ انگلستان ہی نہیں بلکہ سارا مغرب علوم و فنون کے ان کارناموں سے واقف ہوا جو عربوں نے انجام دیئے یہ ایک اہم قدم تھا جس نے یورپ کی تہذیب کو آگے بڑھایا۔ ان تراجم اور تصانیف کا بہت زیادہ اثر ہوا۔ عربی علوم سے جو لوگ بہت زیادہ متاثر ہوئے، ان میں انگلستان کے بلند پایہ فلسفی راجر بیکن (ROGER BACON) اور مشہور شعراء چاسر (CHAUCER) اور لڈگیٹ (LYDGATE) بھی تھے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ (DICTS AND SAYINGS OF THE PHILOSOPHERS) جو اس سلسلے میں انگلستان میں شائع ہونے والی پہلی کتاب ہے اور ۱۴۷۷ء میں طبع ہوئی تھی، ایک عربی تالیف "کتاب مختار الحکم و محاسن الکلم" سے ماخوذ تھی جسے مصر کے امیر مبشر بن فاتک نے ۱۰۵۳ء میں تالیف کیا تھا۔ یہ عربی کتاب ہنوز غیر مطبوعہ ہے مگر اس کا قلمی نسخہ ہالینڈ میں موجود ہے۔ یہ کتاب فلسفیانہ اقوال و امثال پر مشتمل ہے اور ایک زمانہ میں مشرق میں بہت مقبول تھی۔ اس کا ترجمہ یورپ کی بہت سی زبانوں میں ہوا۔

قرونِ وسطیٰ کے یورپ پر عرب ہم عصروں اور ان کے مغربی ترجمانوں کا دوگونہ احسان ہے۔ پہلا احسان

تو یہ کہ یورپ کو یونانی علوم و افکار کے اس گراں مایہ ترکہ کا بڑا حصہ عربوں ہی کے ہاتھوں پہنچا جسے مغرب تو گنوا چکا تھا مگر عربوں نے محفوظ رکھا اور بڑھایا۔ دوسرا احسان یہ ہے کہ یورپ نے عربوں سے تحقیق کا ایک نیا طریقہ سیکھا جس نے عقل (REASON) کو سند (AUTHORITY) پر ترجیح دے کر آزادانہ تحقیق و تجربہ کی اہمیت پر زور دیا۔ یہی وہ دو سبق تھے جنہیں سیکھ لینے کی وجہ سے بہت بڑی حد تک قرونِ وسطیٰ کے دور کا خاتمہ ہو گیا اور دورِ احیاء علوم (RENAISSANCE) کا آغاز ہوا اور جدید یورپ عالم وجود میں آیا۔ انگریز علماء نے ان سبقوں کو دوسروں تک پہنچانے کے سلسلے میں اہم خدمات انجام دیں۔ یہ ایک تاریخی حادثہ ہے کہ ٹھیک اس زمانہ میں عربوں نے وہ باتیں جو انہوں نے یورپ کو سکھائی تھیں، خود بھلانی شروع کر دیں اور کئی صدیوں بعد انہیں پھر سیکھنی پڑیں۔

آیئے اس تقریر کے خاتمہ پر شہر باتھ کے ایڈیلارڈ سے سنیں کہ وہ اپنے بھتیجے سے اس نئے طریق کے متعلق جو اس نے اسپین میں سیکھا تھا، کیا کہتا ہے۔ یہ واضح رہے کہ یہ تحریر آٹھ سو برس پرانی ہے۔

> "میں نے عقل کو اپنا رہبر بنا کر اپنے عرب اُستادوں سے کچھ اور سیکھا ہے مگر تمہیں کچھ اور سکھایا گیا ہے۔ تمہاری آنکھیں سند کی ظاہری عظمت سے خیرہ ہو جاتی ہیں اور تم اپنے منہ پر دہانہ چڑھا لیتے ہو۔ آخر سند کو دہانہ نہ کہیں تو اور کیا کہیں؟ جس طرح وحشی درندوں کے منہ پر دہانہ چڑھا کر جہاں چاہتے ہیں، لے جاتے ہیں اور وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ انہیں کہاں اور کیوں لے جایا جا رہا ہے کیونکہ وہ تو اپنی اُس ڈوری سے جس میں وہ بندھے ہوتے ہیں، پیچھے چلے جاتے ہیں۔ ٹھیک اُسی طرح تم میں سے بہت سے ضعیف الاعتقاد لوگ اپنے بھولے پن اور اندھی تقلید کی وجہ سے مصنفین کی سند سے مرعوب ہو کر ٹھوکریں کھاتے ہیں...... افراد کو اسی لیے تو عقل عطا کی گئی ہے کہ وہ اسے حکم قرار دے کر حق و باطل میں امتیاز کر سکیں...... ہمیں سب سے پہلے عقل و خرد کی تلاش کرنی چاہیئے اور جس وقت وہ دستیاب ہو جائے (صرف اسی وقت اس سے پہلے نہیں) اس کی تائید میں اگر مل جائے تو سند بھی قبول کر لینی چاہیئے۔ سند بذات خود فلسفی کے اعتماد کے لیے کافی نہیں اور نہ اسے اس غرض سے استعمال کرنا چاہیئے۔"

جو لوگ عربوں کی تحریروں سے واقف ہیں اور ایڈیلارڈ کے اس سبق کے ماخذوں کو اور جو لوگ مغربی علوم کا کچھ علم رکھتے ہیں وہ اس کی اہمیت کو فوراً تاڑ لیں گے۔

اِستشراق کی ابتداء پہلی تقریر میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ کس طرح قرونِ وسطیٰ میں انگریز علماء عربوں سے علم حاصل کرنے اسپین اور سسلی گئے اور کس طرح انہوں نے اپنے حاصل کردہ علم کو انگلستان واپس آکر پھیلایا۔ اب ہم ایک نئی ترقی کا ذکر کرتے ہیں جو تحصیل علوم عربیہ کے سلسلے میں رونما ہوئی یعنی اُن علماء کا ظہور جنہیں حال کی اصطلاح کے مطابق اوّلین مستشرقین کہا جا سکتا ہے۔ جس دور کا ہم نے پچھلی صحبت میں مطالعہ کیا ہے اور جس دور سے اس وقت بحث ہے ان دونوں کے درمیان جو عرصہ گزرا، اس میں بہت سے تغیرات پیش آئے۔ اس عرصہ میں یورپ نے تو علوم وفنون میں بہت ترقی کرلی مگر عرب اپنا پچھلا تفوّق بھی کھو بیٹھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب یورپ کے طلباء کو اس کی ضرورت نہ رہی کہ وہ عربی علوم و فنون کی تحصیل کے لیے عرب اساتذہ کی جستجو کریں۔ اس طرح اِستشراق کی ایک نئی قسم ظاہر ہوئی جس نے علومِ مشرقیہ کی جدید تحقیقات کا دروازہ کھولا۔ آج انگریز طلبہ اس غرض سے عربی نہیں پڑھتے کہ وہ عربی علماء سے علوم وفلسفہ میں سبق لیں بلکہ محض عربی زبان حاصل کرنے کی غرض سے پڑھتے ہیں۔ چنانچہ اب انگریزوں نے پہلے پہل سنجیدگی کے ساتھ عربی زبان وادب کا مطالعہ شروع کیا۔ انہوں نے اس سلسلہ میں جو خدمات انجام دیں وہ عربوں اور فرنگیوں دونوں کے لیے اسی طرح سودمند ثابت ہوئیں جس طرح حال کے مستشرقین کی خدمات۔ عربی لغات اور کتب صرف ونحو تالیف کی گئیں۔ عربی کتابوں کے قلمی نسخے مشرق میں مطبع ہونے سے بہت پہلے آراستہ وپیراستہ کرکے طبع کیے گئے۔ عرب کی تاریخ اور عربی ادب کے متعلق تحقیقات کا سلسلہ شروع ہوا اور اسی طرح کے دوسرے کام انجام دیئے گئے۔ یہ تحریک سترہویں صدی عیسوی سے شروع ہوئی۔ اسی صدی میں انگلستان کی دو بڑی یونیورسٹیوں یعنی کیمبرج اور آکسفورڈ میں عربی پڑھانے کا خاص انتظام کیا گیا اور اس غرض سے انگریز پروفیسر مقرر ہوئے کہ وہ شوقین طلبہ کو عربی زبان سکھائیں۔ اُس زمانہ میں پہلے پہل انگلستان میں عربی کتابیں طبع ہوئیں۔ ہم اس موقع پر اُن شخصیتوں کا ذرا زیادہ تفصیل سے ذکر کریں گے جنہوں نے سب سے پہلے اس کام میں حصہ لیا۔

وہ شخص جسے عام طور پر انگلستان میں "تحصیل علوم مشرقیہ کا باوا آدم" مانا جاتا ہے، ولیم بڈویل (WILLIAM BEDWELL) تھا۔ یہ ۱۵۶۱ء سے ۱۶۳۲ء تک زندہ رہا۔ اس کا ایک دلچسپ مقالہ آج بھی موجود ہے جس میں اس نے عربی زبان کی اہمیت اور اُس کے حاصل کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ اس نے عربی زبان کے متعلق لکھا ہے۔ "یہی ایک زبان ہے جسے دینی تقدّس حاصل ہے اور جو جزائر کینیری (الجزائر السعیدہ) سے ملک چین تک سیاسی معاملات اور کاروبار کی خاص زبان سمجھی جاتی ہے۔" بڈویل کو اپنے زمانے میں کافی شہرت حاصل تھی اور وہ تمام یورپ میں علومِ عربیہ کے ماہر کی حیثیت سے مشہور تھا۔ اس کی خاص

تالیف ایک ضخیم عربی لغت ہے جو سات جلدوں میں ہے اور بدقسمتی سے ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ اس کی مطبوعہ کتابوں میں بعض عربی نسخے ہیں جو لندن میں طبع ہوئے اور بعض علومِ قرآنی کے متعلق تحقیقی رسالے ہیں۔ اس نے ان عربی الفاظ کی ایک لغت بھی تیار کی جو بیزنطینی زمانہ سے خود اس کے زمانے تک مغربی زبانوں میں مستعمل چلے آرہے تھے۔

اُس زمانے کی ایک اور نمایاں شخصیت اڈمینڈ کیسٹل (EDMUND CASTELL) ہے جو کیمبرج یونیورسٹی کے اوّلین عربی اساتذہ میں سے تھا اور ۱۶۰۶ء سے ۱۶۸۵ء تک زندہ رہا۔ اس کی زندگی کا اہم ترین کارنامہ سامی زبانوں کی ایک مشترکہ لغت ہے جس کی تالیف میں اس نے اپنی زندگی کے اٹھارہ سال صرف کیے۔ یہ لغت پہلے پہل ۱۶۶۹ء میں شائع ہوئی۔ مؤلف نے اس لغت کے دیباچہ میں خود اپنے متعلق لکھا ہے "روزانہ کم از کم ۱۶ یا ۱۸ گھنٹے روزانہ کام کرکے اور جسمانی تکالیف اور مالی نقصانات اٹھاکر کوئی اٹھارہ سال کی شبانہ روز محنت کے بعد" اس نے یہ لغت تالیف کی۔ یہ لغت جو اپنی نوعیت کی پہلی لغت تھی، بہت اہمیت رکھتی تھی اور انگلستان اور یورپ میں متعدد بار طبع ہوئی۔ اس کے علاوہ کیسٹل کی دوسری کتابوں میں تحصیل علوم عربیہ کی قدر و قیمت کے متعلق ایک رسالہ، ابن سینا کی شرح اور عربی طبع زاد نظموں کا ایک مجموعہ ہے جو انگلستان کے شاہ چارلس ثانی کے نام معنون ہے۔

جان گریوز (JOHN GREAVES) جو ۱۶۰۲ء سے ۱۶۵۲ء تک زندہ رہا، ایک مشہور ریاضی دان تھا اور ایک زمانے میں آکسفورڈ میں علم ہیئت کا پروفیسر تھا۔ اس نے مشرق قریب اور خاص کر مصر کی کافی سیاحت کی تھی اور عربی اور فارسی زبانوں کا بہت گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اس نے عربی اور فارسی کی بہت سی قلمی کتابوں، سکّوں اور جواہرات کا ایک بڑا ذخیرہ فراہم کیا اور فارسی صرف و نحو پر ایک مختصر سی کتاب شائع کی اسے فنِ ریاضی کے متعلق مسلمانوں کی تصنیفات سے خاص دلچسپی تھی اور اس نے اس موضوع پر بہت سے پرانے نسخے اور تحقیقی رسالے شائع کیے۔ اس کا بھائی ٹامس گریوز (THOMAS GREAVES) بھی عربی و فارسی جانتا تھا۔ اس نے بھی چند مضامین شائع کیے۔ سترہویں صدی میں علومِ عربیہ کے ماہرین کی فہرست میں حسبِ ذیل علماء کا نام لیا جاسکتا تھا۔

ابراہیم وہیلاک (ABRAHAM WHEELOCK) کیمبرج یونیورسٹی میں عربی کا پہلا پروفیسر تھا۔ سیموئیل کلارک (SAMUAL CLARKE) جس نے عربی عروض پر ایک مقالہ لکھا اور مشہور مقامات کے عربی ناموں کی ایک لغت تالیف کی۔ برائن والٹن (BRIAN WALTON) جس نے بہت سی مشرقی زبانوں میں توریت شائع کی۔ ڈوڈلی لوفٹس (DUDLEY LOFTUS) جو آئرستانی عالم اور مقنن تھا۔ جان سلڈن

(JOHN SELDEN) جو ۱۵۸۴ء سے ۱۶۵۴ء تک زندہ رہا۔ اس نے ایک محقق اور مدبر کی حیثیت سے اس دور کے انگلستان کی زندگی میں بہت اہم اور نمایاں حصہ لیا۔ جان سلڈن دوسرے علوم کے علاوہ عربی اور دوسری بہت سی مشرقی زبانوں سے واقف تھا۔ اس نے عربی کی ایک تاریخی کتاب کے نسخے کو مرتب کرکے ترجمہ کے ساتھ شائع کیا اور مرنے کے وقت مشرقی زبانوں کی کتابوں کے قلمی نسخوں کا ایک بڑا ذخیرہ چھوڑا۔

علوم عربیہ کے جو ماہرین سترہویں صدی میں گزرے ہیں، ان میں سب سے بلند مرتبہ شخص ایڈورڈ پوکاک (EDWARD POCOCKE) تھا جو ۱۶۰۴ء سے ۱۶۹۱ء تک زندہ رہا۔ یہ پہلا شخص تھا جسے آکسفورڈ میں عربی کا پروفیسر مقرر کیا گیا۔ یہی یورپ کا وہ پہلا مستشرق ہے جس نے حقیقتاً نہایت اعلیٰ درجہ کی خدمات انجام دیں۔ پوکاک نے بچپن ہی میں عربی پڑھنا شروع کر دی تھی۔ اسے ولیم بڈویل جیسے شخص کی شاگردی کا فخر حاصل تھا۔ اس نے کچھ دنوں آکسفورڈ میں میتھو پیسر (MATHEW PASOR) سے بھی تعلیم حاصل کی جو مظالم سے تنگ آکر جرمنی سے بھاگ آیا تھا۔ ۱۶۳۰ء میں وہ حلب گیا اور وہاں پانچ برس رہا۔ اس عرصہ میں اس نے عربی تحریر اور روزمرہ میں کافی مہارت حاصل کرلی۔ وہ عربی کتابوں کے قلمی نسخوں کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ اپنے ساتھ آکسفورڈ لایا اور اس طرح ان نسخوں کو تلف ہونے سے بچایا۔ اس نے حلب کے بہت سے لوگوں سے دوستی پیدا کرلی تھی جن میں خاص کر ایک شیخ فتح اللہ نامی عالم و فاضل تھا جس نے اسے عربی پڑھائی تھی۔ شیخ فتح اللہ کے ساتھ تمام عمر اس کے دوستانہ تعلقات رہے۔

۱۶۳۶ء میں انگلستان واپس آنے کے بعد پوکاک کو آکسفورڈ یونیورسٹی میں عربی پروفیسر کی نئی جگہ پر مقرر کر دیا گیا جہاں وہ عربی ادب اور صرف و نحو کی تعلیم دیتا رہا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی تقریروں کو سننے کے لیے تمام طلبہ کو شرکت پر مجبور کیا گیا۔ نئے پروفیسر نے ابتدائی تقریر میں عربی زبان اور ادب کی اہمیت پر بحث کی اس کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے اقوال پر تقریروں کا ایک سلسلہ شروع کیا۔

۱۶۳۷ء میں اس نے دوبارہ مشرق کا سفر کیا تاکہ نئی معلومات اور کچھ اور قلمی نسخے حاصل کرے۔ اس نے اپنے پرانے دوست فتح اللہ سے ایک بار پھر ملاقات کی۔ وہ ۱۶۴۱ء میں آکسفورڈ واپس آیا اور باقی عمر انگلستان ہی میں علمی کاموں میں صرف کردی اور دوسرے سفر میں مشہور ریاضی دان جان گریوز (JOHN GREAVES) بھی اس کا ہم سفر تھا۔

اس طویل مدت میں جو اس نے آکسفورڈ میں گزاری جہاں انجیر کے مشہور درخت کے نیچے بیٹھ کر جسے وہ ملک شام سے لایا تھا اور جو اب بھی موجود ہے اور غالباً انگلستان میں سب سے پرانا انجیر کا درخت ہے

(باقی آئندہ)